اقبال کے ہاں تقدیر کا تصور

خلیفہ عبد الحکیم

اقبال کے تصورات اور افکار میں ہر جگہ ایک نیا زاویہ نگاہ نمایاں ہوتا ہے ۔ ملت اسلامیہ میں صدیوں سے جو تصورات ذہنوں پر مسلط تھے ان میں سے ہر ایک کے تصور کی تحصیل اقبال نے کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور ملی زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر تصورات کو ایسے معنی پہنا دئیے گئے ہیں جو اصل مفہوم سے بہت دور ہیں اور حیات بخش ہونے کی بجائے حیات کش ثابت ہو رہے ہیں ۔ مفسروں ، فقیہوں اور صوفیوں سے اقبال کو یہی شکایت ہے کہ وہ قرآن اور اسلام کی تاویلوں میں روح اسلام سے بہت دور جا پڑے ۔ امام رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ فیہ کل شي الا التفسیر کہ اس میں اصل تفسیر کو چھوڑ کر اور سب کچھ ملتا ہے ۔ اکثر اور تفسیروں کے متعلق بھی اقبال کی یہی رائے تھی ۔ توحید اور ایمان ، قناعت اور توکل ، تقلید اور اجتہاد ان سب اساسی تصورات کا مفہوم مسلمانوں کے مذہبی اور عقلی رہنماؤں نے کچھ ایسا بدل دیا کہ زندگی کی تخلیقی قوتیں اس قوم کے اندر سرد پڑ گئیں اور ٹھٹھر کر رہ گئیں :

زما برسان بہ ملایان سلامے　　　　کہ دادند پیغام خدا را
ولے تاویل شان درحیرت افگند　　　　خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

اقبال کا خیال تھا کہ تقدیر کے غلط مفہوم نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہت نقصان پہنچایا ہے ۔ تقدیر اور تدبیر کا مسئلہ حقیقت میں اہم ترین مسائل میں سے ہے اور کسی فرد یا قوم کی زندگی کا رخ بہت کچھ اس سے متعین ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق اس کا انداز فکر کیا ہے ۔ اقبال کا تمام کلام خودی کے تعین اور تلقین سے لبریز ہے اور سب باتوں سے زیادہ وہ مبلغ خودی ہی نظر آتا ہے ۔ حقیقت میں اس تبلیغ میں ایک عظیم الشان ذہنی انقلاب مضمر ہے ۔ تقدیر کا مفہوم بھی اسی کی ایک شاخ ہے ۔ اقبال سے پہلے خودی ایک مذموم تصور شمار ہوتا تھا ۔ یہ لفظ غرور اور پندار اور خود غرضی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ انسانوں کی تقسیم اس طرح کی گئی تھی کہ بعض خودی پسند ہیں اور بعض خدا پسند اور یہ دو متضاد باتیں شمار ہوتی تھیں ۔ انہیں معنوں میں کسی کا یہ ایک شعر مشہور ہے :

تجھ کو خودی پسند ہے مجھ کو خدا پسند
تیری جدا پسند ہے میری جدا پسند

اقبال سے قبل مسلمانوں کے تمام لٹریچر میں خودی کا لفظ انہیں مذموم معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ پہلے فلسفیوں نے خواہ وہ مادی ہوں یا روحانی کسی نہ کسی رنگ میں انسان کی خودی کو باطل قرار دیا - مادیت میں تو نفس انسانی ہی کی کوئی حقیقت نہیں رہتی، اس میں کسی قسم کی خودی کا تصور کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے ۔ مادیت حقیقت میں ایک طرح کی تقدیر پرستی ہے خواہ وہ تقدیر اندھی ہی ہو - تمام اعمال مادے کے اٹل قوانین سے متعین ہوتے ہیں ، کسی واقعہ کی کوئی غرض و غایت نہیں ہوتی ، حیات و کائنات میں کوئی مقاصد نہیں ، ہر مظہر وجود علت و معلول کی زنجیر کی ایک کڑی ہوتا ہے ۔ مادے کے میکانکی عمل میں ریاضیاتی اصول کا اطلاق ہوتا ہے ۔ جس طرح ریاضیات کے اصول اٹل ہیں اسی طرح ہر علت اور ہر معلول کا عمل ناقابل تغیر میکانکی اصول کے ماتحت ہوتا ہے ۔ انسان کا نفس اور اس کے ارادے کسی چیز کو بدل نہیں سکتے - نفس خود ایک بے بس مظہر ہے ۔ تمام ارادے مادے کے جبر سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے نتائج بھی مادی جبر سے ہی ظہور میں آتے ہیں ۔ نیک کی نیکی اور بد کی بدی قابل ستائش ہیں اور نہ لائق مذمت ۔ مادیت کے اس تصور کا اثر تمام موجودہ سائنس میں نمایاں ہے اور اکثر سائنسدان انسانی زندگی کو بھی اسی جبری زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں ۔

مادیت کے علاوہ اکثر مذاہب نے بھی کسی نہ کسی قسم کے تقدیری جبر کو اپنی تعلیم کا اہم جزو بنا لیا تھا ۔ کسی نے کہا کہ آدم و حوا نے ایک گناہ کیا تھا جسے خدا نے معاف نہ کیا اور اس کی تمام اولادیں توارثی جبر کے تحت گناہ کی مرتکب ہوں گی ۔ اب ہر انسان ناکردہ گناہ اس پاداش کو لئے ہوئے ہوتا ہے اور وہ اس کو کسی اچھے سے اچھے اعمال سے بھی بدل نہیں سکتا ۔ البتہ چند ناقابل فہم عقائد کو تسلیم کر لینے سے اس سے چھٹکارا حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی نے قانون اخلاق کو اس انداز کا قانون حیات بنایا کہ ہر نیک و بد فعل ایک ایسی زنجیر کی کڑی ہے جس کا ایک سرا ازل سے اور دوسرا ابد سے ملا ہوا ہے ۔ زندگی کی غرض یہ بتائی کہ نیک اور بد دونوں قسم کے اعمال سے ماوراء ہو جانا چاہئے اور اس کا واحد نسخہ یہی ہے کہ ہر ارادے اور ہر خواہش کو ملیامیٹ کر کے خودی کا نام و نشان مٹا دیا جائے ۔ انسان جب قطعاً بے مدعا ہو جائے گا تو خدا ہو جائیگا یا وہ نہیں رہے گا اور خدا ہی خدا رہ جائے گا ۔ یہ نظریہ حیات مسلمانوں کے تصوف میں بھی داخل ہوگیا اور شعرائے متصوفین نے اس ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا ہے ۔ غالب کے ہاں کثرت سے اس مضمون کے اشعار ملتے ہیں :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بعض صوفیا نے ایک مقولہ وضع کر لیا : وجودک زنب — یہ نہیں کہ انسان کبھی کبھی گناہ کا بھی مرتکب ہوتا ہے بلکہ سرے سے اس کا اپنے انفرادی وجود کو حقیقی سمجھنا گناہ ہے ۔ اصل عرفان نفس اس کو قرار دیا کہ نفس کو کالعدم تصور کیا جائے :

گو لاکھ سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

انسانی خودی کے نیست ہو جانے کے بعد بس خدا کی ذات اور اس کی صفات کے مظاہر رہ جائیں گے ۔ اس کو تقدیر الٰہی کہ لیجئے ۔ یہ تقدیر خدا کے اپنے افعال ہی کی تقدیر ہوگی ۔ انسان کے اعمال ، اس کے ارادے ، اس کے مقاصد، پاداش عمل ، ثواب و عذاب، ترقی و تنزل سب مجازی اور اعتباری حیثیت اختیار کر کے موہوم و معدوم ہو جائیں گے ۔ مادیت نے مادے کی همه گیری سے تقدیر جبری قائم کر کے انسانی نفس اور اس کی خودی کو سوخت کر دیا تھا ۔ اہل مذہب نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر کے نفس کی خود اختیاری حیثیت کا خاتمہ کر دیا ۔ جہاں توحید نے وحدت وجود کا رنگ اختیار نہیں کیا اور خالق و مخلوق اور عابد و معبود کی تمیز و تعریف کو قائم رکھا ، وہاں بھی خدا کی قدرت مطلقہ کا ایک تصور قائم ہو گیا جس سے زندگی میں جبر حقیقی اور اختیار مجازی بن گیا ۔ خدا قادر مطلق ہے ، خیر و شر دونوں کا خالق ہے ، جسے چاہا جیسا بنا دیا ۔ خیر و شر کا قانون جاری کر دیا لیکن اختیار کسی کو نہیں دیا ۔ نیک سے نیکی کرائی اور اس کو اجر دے دیا اور بد سے بدی کرائی اور اس کو سزا دے دی چونکہ وہ فعال ما یرید ہے اور اس لئے اس سے باز پرس نہیں ہو سکتی ۔ کائنات کو وجود میں لانے سے قبل ذرے ذرے کی حرکت کو تا ابد متعین کر کے لوح محفوظ میں درج کر دیا جہاں سے کوئی حرف ادھر ادھر نہیں ہو سکتا ، نہ مٹ سکتا ہے نہ اضافہ ہو سکتا ہے ۔ اگر خدا چاہتا تو چور چوری نہ کرتا لیکن اپنی مشیت سے اس نے ایسا چاہا تو اس نے ایسا کیا ۔

اسلام کی تعلیم میں خدا کی قدرت کاملہ کی بھی تلقین تھی اور انسان کی اپنے اعمال کی ذمہ داری پر بھی زور تھا ۔ لیکن تقدیر کے متعلق مسلمانوں کے اکثر مفکرین نے ایسا انداز استدلال اختیار کیا کہ تمام ذمہ داری کالعدم ہو گئی اور شعراء نے کہنا شروع کر دیا :

حافظ بخود نہ پوشید این خرقہ مے آلود
اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را
در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

میر تقی کہتا ہے :

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

آزاد کہتا ہے :

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں ، بے اختیار بیٹھے ہیں

اقبال نے اس تمام تصور کے خلاف بغاوت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی خاک زندہ نہ تابع ستارہ ہے نہ اس پر مادیت کا جبر مسلط ہے اور نہ خدا کا جبر۔ خدا نے انسان کے جسم کو مٹی سے بنایا لیکن اپنی روح اس کے اندر پھونک دی۔ اختیار روح الہی کا جوہر ہے اس لئے انسانی روح اس جوہر سے کس طرح معرا ہوسکتی ہے۔ انسان کو خلیفہ‘ کائنات بنایا گیا اور اس کو ایسی قوتیں ودیعت کی گئیں جن کو کام میں لا کر وہ تمام موجودات کو مسخر کرسکے۔ تقدیر پرستوں نے اس خلیفة اللہ اور مسخر کائنات کو مجبور محض اور ذرہ‘ بے اختیار بنادیا۔ طلوع اسلام کے وقت تقدیرکا صحیح مفہوم اور انسان کا صحیح مقام اور صحیح وظیفہ‘ عمل سمجھنے والوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی اور اسی حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسان کی تقدیر کائنات کی تسخیر ہے۔ آفرینش آدم عالم کے اندر ایک زبردست انقلاب تھا اور اس انقلاب کی غایت یہ تھی کہ ایک انقلاب آفرین ہستی کو وجود میں لایا جائے۔ خدائے خلاق نے اپنی مخلوق میں سے ایک نوع کو اپنی خلاقی میں سے حصہ دیا۔ تفصیلی طور پر بنی بنائی اور لکھی لکھائی تقدیر پر گامزن ہونے والی مخلوق حقیقی آزادی اور اختیار سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے خلاقی میں حصہ نہیں لے سکتی۔ انسان کو خودی اس لئے عطا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کو باطل قرار دے کر اس کو معدوم کرنے میں مصروف ہوجائے ؛ خودی اس لئے عطا ہوئی تھی کہ وہ اس کو بلند کرتا ہوا خدائے قادر کی مشیت کا ہم کار ہوجائے۔ خودی صفات الہیہ کو جذب کرتی ہوئی اپنی رضا کو اس کی رضا کے ساتھ اس طرح ملادے کہ تمیز کرنا دشوار ہوجائے جس طرح لوہا آگ کو جذب کرکے اس کا ہم رنگ اور ہم صفت بن جاتا ہے۔ اقبال کا تصورتقدیر اس کے فلسفہ‘ خودی کا ایک حصہ ہے :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ؟

تفصیلی طور پر معین تقدیر تو اقبال کے نزدیک خدا کو بھی صحیح معنوں میں خلاق نہیں بناتی۔ اس قسم کی قضا تو خود خدا کے لئے قضائے مبرم بن جائے گی۔ خدا کی خلاقی یہ ہے کہ کل یوم ھو فی شان ۔ انسانوں نے خدا کے علم کو اپنے علم پر قیاس کرکے اس کی خلاقی کو اس کے ازلی و ابدی طور پر معین تفصیلی معلومات کے ماتحت کردیا ۔ اقبال کے نزدیک خلاقی علم کے ماتحت نہیں بلکہ

علم خلاق کے ماتحت ہے ۔ اصلی خلاق خواہ خدا کی ہو اور خواہ خدا کی مرحمت کردہ انسانی قوت سے سرزد ہو ، وہ آزاد ہوتی ہے ۔ خلاق کی آزادی یہی خدا کی تقدیر ہے اور یہی انسان کی تقدیر ۔ مسخر کائنات مجبور کائنات کیسے ہوسکتا؟ اقبال کو جو عارف رومی سے عقیدت تھی اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قدیم صوفیائے کرام اور حکما میں اسی مرشد کامل نے نفی خودی اور جبر محض کے خلاف زور شور سے احتجاج کیا ۔ جس وقت ایک طرف یونانی حکمت نے اور دوسری طرف فنا پسند تصوف نے انسان کی خودی کو باطل کردیا تھا اس وقت رومی نے یہ آوازہ بلند کیا کہ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ مخلوقات کو مسخر کرتا ہوا آخر میں خدا کو بھی مسخر کرے' اگرچہ اس آخری منزل میں شکار مسخر کرنا اور مسخر ہونا ایک ہی بات ہوجائیں گے :

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

خدا کی کبریائی اور عظمت کے سائے میں کچھ ایسے مردان جری بھی نظر آتے ہیں جو فرشتوں کا، پیمبروں کا بلکہ خدا کا بھی شکار کرنے میں لگے ہوئے ہیں ۔ اقبال کو رومی کا یہ جری تصور بہت پسند تھا اسی لئے اس نے رومی کے اس خیال کو اپنے ایک شعر میں دہرایا ہے ۔ جبریل کو صید زبوں بنانے کے بعد یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ ۔

رومی کے زمانے میں بھی یہ تصور عام ہوچکا تھا کہ جد وجہد کرنا قضا سے خواہ مخواہ کشتی لڑنا ہے ۔ توکل اور قناعت اور تسلیم و رضا کے یہ معنی لئے گئے تھے کہ اللہ اللہ کرو اور جو کچھ خدا دکھائے یا کرائے اس کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ ۔ رومی نے مثنوی میں اس موضوع پر بڑی حکیمانہ بحث کی ہے ۔ فرماتے ہیں :

با قضا پنجہ زدن نبود جہاد زاں کہ آں را خود قضا بر ما نہاد

کوشش کرنا قضا کے خلاف جدوجہد کرنا نہیں ہے' خود قضا نے اس جد وجہد کو انسان کے لئے مقدر کردیا ہے ۔ تقدیر قانون عمل کا نام ہے کہ خاص قسم کے اعمال سے خاص قسم کے نتائج سرزد ہوں گے ۔ چور چوری کرےگا تو اس کی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوگا ' اس کا نام تقدیر ہے ۔ یہ نہیں کہ ازل سے یہ معین ہوگیا تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت ضرور چوری کرے گا ۔ اگر تقدیر کا یہ مفہوم ہو تو قانون اخلاق اور جزا و سزا سب بے معنی ہوجاتے ہیں ۔ قرآن نے تقدیر کا صحیح مفہوم سمجھایا تھا اور اس مفہوم کو سمجھ کر عمل کرنے والوں کو خلافت الہی عطا ہوئی تھی۔ غلط بین مفسروں نے اسی قرآن سے ترک دنیا کی تعلیم کو اخذ کرنا شروع کردیا اور جدوجہد کرنے والی قوموں نے ان کو پیچھے چھوڑدیا ۔

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

ایک نظم میں اقبال نے تقدیر پر غور کرتے ہوئے افراد اور اقوام کی تقدیر کے متعلق دو الگ الگ خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فرد کی تقدیر تو بعض اوقات ہمارے لئے اچھی طرح قابل فہم نہیں ہوتی۔ کہیں کوئی اہل ذلیل نظر آتا ہے اور نا اہل معزز و با وقار۔ کہیں دانا کو رزق سے محرومی ہوتی ہے اور نادان کو بے کوشش بہت کچھ مل جاتا ہے۔ کہیں خرد مند محکوم ہے اور بے خرد حاکم۔ نا اہل صاحب اقتدار ہے اور جوہر ذاتی رکھنے والا بے بس اور خوار۔ یہ راز تو عقل پر منکشف نہیں ہوتا۔ لیکن قوموں کی تاریخ اس حقیقت کو ضرور واضح کرتی ہے کہ قوموں کی تقدیر صریح طور پر ان کے اعمال کے ساتھ وابستہ ہے:

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
بران صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

©2002-2006 All rights reserved